مطلق العنان اقتدار کے تحت مجدد و مذہبی مناصب

اوّلین تجربہ ــــ خلافت عباسیہ میں

از جناب نعیم صدیقی صاحب

[اس مضمون کے پہلے حصے میں خلافت عباسیہ کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جسے سامنے رکھ کر ہی اس اصلی بحث کو سمجھا جا سکتا ہے جو دوسرے حصے میں آ رہی ہے۔ یہ اصلی بحث آئندہ شمارے میں دی جا رہی ہے]

کتنا بڑا سانحہ تھا کہ عین وہی ملّت یا جماعت جو دنیا سے مطلق العنان اقتدار اور شخصی و موروثی حکومت کا سلسلہ ختم کرنے اٹھی تھی، چند ہی قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گری تو ایسی گری کہ مطلق العنان اقتدار اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا اور اس نے جبر و استبداد کے کوڑے کے بل پر اسے صدیوں تک منزل مقصود سے اُلٹی سمت میں دوڑایا۔

مطلق العنان اقتدار کی فطرت کسی حکمراں فرد کی نرمی کے باوجود انسانیت کے لیے کبھی مشفقانہ نہیں ہوتی بلکہ قہر و غضب اس کا مزاج ہے، جور و ستم اس کا وصف ہے، تلوار اس کی دلیل ہوتی ہے اور تخویف و تہدید کی آب و ہوا میں وہ پھلتا پھولتا ہے۔ یہی صورت ہمیں اپنی تاریخ میں پیش آئی۔ خوں ریزیاں، سازشیں، اصلاحی و تعمیری رجحانات کو کچلنے کی کوششیں، مساوات و جمہوریت کی غارت گری، ضمیروں سے زندگی چھیننے کی تدبیریں، یہ ساری چیزیں مطلق العنان اقتدار کے لوازم میں داخل ہیں۔ حضرت امیر معاویہ کی نیت کچھ بھی رہی ہو اور ان کے رجحانات اور فیصلوں کے حق میں کیسے بھی دلائل ہمارے پاس ہوں لیکن ان کے ہاتھوں سے تاریخ کے دھارے کا رُخ

ذرا سا جو بدلا تو پھر یہ گھماؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ موروثی شخصی سلطنت کو خلافت کا نام دینے کے باوجود یہ ناگزیر تھا کہ اس درخت سے یزید، ابن ہبیرہ، حجاج، مروان اور ہشام جیسی شاخیں پھوٹیں اور کربلا، حرّہ اور قتلِ سادات جیسے برگ و بار آئیں۔ پھر یہ بھی ناگزیر تھا کہ اس درخت کی چھاؤں میں اموا پرستانہ عجمی ثقافت کی مجلسیں آراستہ ہوں جن میں شرابِ عشرت کے دور چلیں اور مغنیانِ آتش نوا متاعِ ہوش کے رہزن بنیں — درآنحالیکہ اردگرد ممتاز داعیانِ حق ذبح ہو رہے ہوں اور مسلم عوام کے لاشے تڑپ رہے ہوں۔

ملت نے اس تبدیلی کو دیر تک قبول نہیں کیا اور اس کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی انقلابی تحریکیں اٹھائیں۔ سب سے پہلے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اٹھے (۶۰ھ) پھر عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے بھائی مصعب (۶۵ھ تا ۷۳ھ) نمودار ہوئے، پھر زید بن علی (۱۲۱ھ) اور یحییٰ بن زید (۱۲۵ھ) آگے بڑھے اور یہ انقلابی لہریں پے در پے اٹھتی رہیں۔ بلکہ زیدی تحریک کو بھی ایک حد تک، اور اس کے بعد نفس زکیہ کی تحریک کو خاص طور پر ایک طرف مدینہ میں حضرت امام مالکؒ کی اور کوفہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ زید کے متعلق حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد تھا کہ "ان کا نکلنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کی طرف اقدام کرنے کے مشابہ ہے"[۵] ان کو دس ہزار روپیہ کی مالی امداد بھی روانہ کی[۶] حضرت امام ابوحنیفہ بہ حیثیت ایک انقلابی شخصیت کے نہ صرف عملاً بڑی مہارت سے مختلف ادوار میں مختلف اسالیب سے کام کرتے رہے اور مطلق العنان اور جبر کیش اقتدار کی ناک کے عین نیچے بیٹھ کر انہوں نے نت نئی راہیں نکالیں بلکہ ان کی بصیرت بھی اس معاملے میں کوئی نظیر نہیں رکھتی انہوں نے

---

[۵] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۱۰۳

[۶] " " " " ص ۱۱۴ بہ حوالہ "مناقب موفق" ج ا ص ۲۶۰

انقلاب کا بہترین موقع اس دورِ تحول کو سمجھا جبکہ اموی اقتدار متزلزل ہو رہا تھا اور صرف ایک دھکے کا محتاج تھا اور دوسری طرف مختلف قوتیں ۔ شیعہ، خوارج، ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں اہلِ فارس ۔ میدان مارنے کے لیے بڑھ رہے تھے تاریخ التشریع الاسلامی میں خضری نے امام کی بصیرت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ بنو امیہ سے بنو عباس کی طرف انتقالِ اقتدار کا موقع جب حضرت ابو حنیفہ کے سامنے آیا تو اس دورِ تحول میں کوفہ ایک عظیم انقلابی تحریک کا مرکز بن گیا[1] اس موقع پر نفس زکیہ کی تحریک (خروج ۱۴۵ھ) زیرِ زمین تیار ہو رہی تھی۔ یہ تحریک جس کی زمام بعد میں ابراہیم بن عبداللہ (نفس زکیہ کے بھائی) نے سنبھالی، اس کے حق میں امام صاحبؒ نے زور شور سے (جہاراً) کام کیا اور لوگوں کو فتویٰ دیتے تھے کہ اس میں شرکت ۵۰ حج سے زیادہ افضل اور سرحد پار کفار کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ باعثِ ثواب ہے[2]۔ ادھر اسی تحریک کی حمایت میں حضرت امام مالکؒ نے منصور کی حکومت کے جواز کو چیلنج کرتے ہوئے جبری بیعت کو کالعدم قرار دیا۔ اور مسئلہ بیعت پر گفتگو کرنے میں مزاحمت دیکھی تو جبری طلاق کے عدمِ وقوع کے اعلان کو ذریعہ کار بنایا[3]۔ یہ تحریک عباسی حکومت کے ظہور کے بعد سطح پر آئی۔ اور الیافعی کے بیان کے مطابق اس کی وجہ سے منصور جیسے جابر حکمران کے لیے ۵۰ دن تک خواب و خور حرام ہو گیا تھا[4]۔ اگرچہ موجِ خونِ انقلاب پسندوں کے سر سے گذر گئی مگر ان کے کارناموں نے اس دور کی تاریخ کو ہمارے لیے باعثِ ننگ نہیں بننے دیا۔

---

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام ۔ از محمود بن محمد بن عرنوس ص ۴۲ [2] ایضاً ص ۴۷

[3] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۴۹ تا ۲۵۱

[4] تاریخ ابن اثیر کامل ج ۵ ص ۱۹۷

[4] ائمہ اربعہ ۔ از رئیس احمد جعفری ندوی ۔ ص ۶۰

اموی دَور میں عربوں کے تفوق اور ان کے خلافِ مساوات رویّے نے ایرانیوں میں جو بیزاری پیدا کر دی تھی اس سے کام لے کر ابو مسلم خراسانی نے خراسان میں اپنی ایک تحریک چلا رکھی تھی اور بنو امیہ کے خلاف مختلف عناصر کے رجحانات سے وہ اپنے سرمایہ کار میں اضافہ کرتا رہا۔ اہلِ بیت کی روحانی امامت جب عباسیوں میں منتقل ہوگئی تو بنی امیہ کے خلاف کام کرنے کے لیے ان کا تعاون ابو مسلم خراسانی سے ہوگیا۔ عباسی اپنی جگہ ابو مسلم خراسانی کو اور ابو مسلم خراسانی عباسیوں کو استعمال کرنے کے درپے تھے۔ آخر بنو امیہ کا تخت اُلٹ گیا اور عباسی سلطنت قائم ہوئی۔

حالات جب غلط رُخ پر پڑ جاتے ہیں تو لوگ بار بار تبدیلی کی تمنائیں کرتے ہیں لیکن ہر بار جو تبدیلی آتی ہے وہ بد سے بدتر مراحل میں لے جاتی ہے۔ یہی یہاں بھی ہُوا۔ وہ تمام خرابیاں جو بنو امیہ کے دَور سے اٹھیں ان کی تکمیل بنو عباس کے دَور میں ہوئی۔ واضح رہے کہ افراد اور اشخاص میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور ہر کسی کے اچھے کارنامے بھی موجود ہیں۔ ان کا انکار نہیں ــــ مگر تاریخ کا طالب علم افراد کا سوانح نگار نہیں ہے۔ اسے تو یہ دیکھنا ہے کہ اجتماعی زندگی کا تاریخی دریا کس رُخ پر بہہ رہا تھا اور کدھر کو بہایا جا رہا تھا۔

بنو عباس کے دَور کے نہایت ہی اہم پہلو یہ تھے:

مطلق العنانی اور استبداد | مطلق العنان اقتدار عجم کے معروف نظریہ ــــ بادشاہت کے خدائی حقوق ــــ پر استوار ہُوا۔ منصور کا اپنا قول تھا کہ "میں دنیا میں خدا کی طرف سے حکمران ہوں[1]" حضرت جابرؓ (صحابی رسولؐ) کو ایک نازک موقع پر ان کے شاگرد قبیصہ نے کہا تھا: "ان ھولاء القوم صاروا ملوکا[2]" بقول سید امیر علی: "خلیفہ تمام اختیارات کا منبع تھا[3]"

---

[1] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) ــ از پروفیسر علی ابراہیم حسن ص ۱۷۰

[2] طبقات ابن سعد

[3] A SHORT HISTORY OF SARACENS — By AMEER ALY SYED — P: 405

جبر و استبداد کے لحاظ سے عباسیوں نے امویوں کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ یہ حکومت تنقید کی متحمل نہیں تھی جیسے کہ مامون نے قاضی ابن ابی دوٗاد سے کہا تھا کہ ضرورت کسی کی نکتہ چینی کی پرواہ نہیں کر سکتی (المامون - ۱۵۲)۔ ابو مسلم خراسانی سے ایک شخص نے پوچھا کہ کالا لباس کس بنا پر اختیار کیا گیا ہے۔ اس نے جواب دینے کے بعد اسکی گردن اڑا دی کہ اس نے سوال کیوں کیا؟[1] ۶ لاکھ افراد کا خون اس شخص کی گردن پر ہے۔ سفاح نے دورِ عباسی کا آغاز اس شان سے کیا کہ امویوں کا خون بے دردی سے بہایا، اُن کی قبریں اکھیڑ دیں اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی[2]۔ ایک عباسی سپہ سالار نے ۸۰ سر برآوردہ امویوں کو دعوت میں بلایا اور مہمانوں کے سامنے ان کی گردنیں مار کر ان کے تڑپتے لاشوں کے اوپر ہی دستر خوان بچھا کر ضیافت کا لطف اٹھایا[3]۔ ایک عباسی سردار کہتا ہے: اگر امیر المومنین ہمیں نماز میں قبلہ کی طرف پیٹھ کرنے کا بھی حکم دیں، تو بھی ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے[4]۔ پھر منصور نے نفس زکیہ اور ابراہیم کی تحریک کو کچلنے کے بعد سادات کا بیج مار دینے کی مہم چلائی۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسی ہستیوں کی کھال کوڑوں سے ادھیڑ ڈالی۔ عباسیوں کے دربار کا ایک مستقل جزو نطع ہوتا تھا یعنی وہ چمڑا جس پر بٹھا کر جلاد اجل رسیدگاں کے سر قلم کرتے تھے[5]۔

ایسا مطلق العنان، جابرانہ اور شخصی اقتدار جو رائے عام سے بے نیاز اور معینہ دستوری حدود سے بالاتر ہو، ضمیروں پر چونکہ خوف کی منحوس پرچھائیں ڈالے رکھنے پر مجبور تھا، اس لیے

[1] تاریخ بغداد۔ از خطیب بغدادی ج ۱۰، ص ۲۰۸

[2] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین ندوی۔ حصہ ۳، ص ۸

[3] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ)۔ از پروفیسر فلپ کے ہتّی۔ ص ۱۰۲۔

[4] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۲۱۵ بحوالہ "رسالۃ الصحابہ" از ابن المقفع۔

[5] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر کے فلپ ہتی ص ۱۰۲۔

خفیہ پولیس اور جاسوسی کا انتہائی کڑا انتظام قائم تھا۔ اس کام کے لیے "صاحب البرید" (ڈائرکٹر محکمۂ ڈاک) کے علاوہ خفیہ پرچہ نویس بھاری تعداد میں مقرر تھے، گھوم پھر کر رجحانات کا جائزہ لینے کے لیے ہر طبقے کے افراد بڑی بھاری تعداد میں مامور تھے[1] حتیٰ کہ دارالحکومت میں ۱۷۰۰ عجوزہ عورتیں (کٹنیاں) گردش کرتی تھیں[2]۔ یہ جاسوسی نظام فی نفسہٖ نہایت فاسد بھی تھا، چنانچہ اس پر امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں گرفت کرتے ہوئے خلیفہ سے یوں خطاب کیا ہے کہ:

> "حکام اور رعایا کے جن حالات سے ان کو واقف اور باخبر ہونا چاہیے ان سے بے توجہی کرتے ہیں، رعایا کے معاملات میں حکام کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور ان کی زیادتیاں اور صحیح خبریں چھپاتے ہیں، جو والی اور عمال ان کو راضی نہیں رکھتے ان کے متعلق غلط خبریں دیتے ہیں۔۔۔ ان کی جگہ عادل اور ثقہ لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے، کسی غیر عادل خبر رساں کی اطلاع کو قبول نہ کرنا چاہیے، جو لوگ خبروں کو چھپائیں یا ان میں اضافہ کریں ان کو سزا دی جائے[3]۔"

ان سنگین حالات کے پنجرے میں قرنہا قرن بے بسی سے جکڑے رہنے کی وجہ سے ہی مسلمانوں کے ذہن نے بادشاہت کے ساتھ ایسی سازگاری کر لی کہ ایک طرف ان کا پورا فلسفۂ سیاسیات (معمولی استثناء کے ساتھ) بادشاہت کے محور کے گرد گھوم گیا اور دوسری طرف ان میں جابرانہ اقتدار کے تحت اطمینان سے پڑے رہ کر ظلم سہنے اور اطاعت کرتے رہنے کی مستقل خصلت پیدا ہو گئی بلکہ طبائع کچھ شاہ پرست سی ہو گئیں۔ ایک

---

[1] A SHORT HISTORY OF SARACENS – BY AMEER ALI SYED – PP 406-408

مزید تفصیلات کے لیے: وفیات ابن خلکان۔ ترجمہ فراء نحوی۔

[2] المامون۔ از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۴۵۔ بحوالہ: آثار الدول کرمانی (ذکر خلافت المامون)

[3] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین ندوی۔ حصہ ۳ ج ۱ ص ۱۲۱

گروہ جہاں احیائے اسلام کے لیے انقلابی نظریہ کا داعی اور اس پر عمل پیرا بھی رہا، وہاں دوسرے گروہ کا مخلصانہ نظریہ یہ قرار پایا کہ "حکومت کے ظلم و جور پر اعتراض نہ کرنا چاہیے" — خواہ وہ خدا کے حرام کردہ خون کو بہا رہی ہو۔[1]

عجمیت | بنو عباس کی حکومت اہلِ فارس کے کندھوں پر قائم ہوئی تھی۔[2] جاحظ اسے "اعجمیۃ خراسانیۃ" کہتا ہے۔[3] بنو عباس فارسی اثرات سے مغلوب ہو گئے اور یہ اثرات سیاسی دائرے ہی میں نہیں، فکر اور ثقافت کے دائروں میں بھی گھس گئے اور انہوں نے اسلامی حکمت و تہذیب کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ امویوں کے ہاں قیادت اور نظمِ ملکی عربوں کے ہاتھ میں تھا اور اس معاملے میں غلو اور زیادتی سے کام لے کر ایرانیوں کو بددل کر دیا گیا۔ اس غلطی نے عباسیوں کے ہاں اپنا رُخ اُلٹی سمت میں پھیر دیا۔ اب عربوں کو پیچھے ہٹا دیا گیا اور اہلِ فارس دربار، نظم و نسق اور فوج پر حاوی ہو گئے۔ تاریخی کلیہ ہے کہ کسی حکومت کے قیام، اس کے بقا یا اس کے استحکام میں جو قوت سہارا بنتی ہے وہی پسِ پردہ حکومت پر چھا جاتی ہے۔ وہ قوت خود رائے عام کی قوت ہو، کسی طبقۂ خاص کی قوت ہو، کوئی غیر ملکی قوت ہو، سکّہ اسی کا چلتا ہے۔ چنانچہ ایرانیوں نے حکومت اور معاشرے کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ بیرونی نفوذ کا جو راستہ ایرانیوں کے لیے کھلا، اس سے پھر یونانیوں، ترکوں، مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے فکری و ثقافتی اثرات کے قافلے پے در پے داخل ہونے شروع ہوئے۔ نقشہ زیر و زبر ہو گیا۔ معاشرہ ایک معزز گھرانے کے بجائے ایک کارواں سرائے کی صورت اختیار کر گیا۔ چونکہ خود قیادت کا ذہن مرعوب تھا اس لیے بیرونی اثرات کا مقابلہ معاشرہ کی طرف سے مضبوطی سے نہ کیا گیا۔ چنانچہ اس دور میں ایسے ایسے اعتقادی

[1] تفسیر احکام القرآن۔ ابوبکر جصاص ج ۲ ص ۳۴ و ۲۱۴

[2] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر محمد امین مصری۔ ج ۱، ص ۳۵

[3] البیان والتبیین۔ ج ۳، ص ۲۰۶

اور اخلاقی فتنے اٹھے کہ آج تک ان کے اثرات سے نجات نہیں ہو سکی۔

ثنویت اموی دور میں اگرچہ شخصی بادشاہت آئی مگر وہ بیٹھی خلافت ہی کی مسند پر تھی، اور ذہنوں میں اسی کا اثر تھا۔ مگر عباسی دور میں جب مطلق العنان اقتدار جوان ہو گیا تو وحدتِ نظام باقی نہ رہی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ثنویت آ گئی۔ یعنی تاریخ کی ندی دو دھاروں میں بٹ کر بہنے لگی۔ ایک دنیویت کا دھارا، دوسرا مذہبی دھارا۔ آہستہ آہستہ خلیفہ اور سلطان دو الگ الگ ادارے پیدا ہو گئے۔ خود علم میں تقسیم ہو گئی۔ دنیوی عقلی علوم (فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات) خلفاء، امراء اور اغنیاء کی سرپرستی میں نشو و نما پانے لگے اور علم دین (تفسیر و حدیث) ایوان سے باہر پرورش پانے لگا۔ دنیوی علم کے حاملین عیش میں تھے اور دینی علم کے حاملین فقر و فاقہ کے شکار!۱ ادب کی دو روشیں الگ الگ ہو گئیں ایک نزعۃ اللھو، یعنی رندانہ یا رومانوی ادب اور دوسری نزعۃ الزھد، یعنی صوفیانہ ادب۲۔ دنیائے فکر کے دو حصے ہو گئے، ایک طرف ایمانِ خالص اور اعتقادِ صادق تھا اور دوسری طرف شک اور زندقہ و الحاد ـــــ بلکہ الحاد و زندقہ کی ایک طوفانی تحریک! دونوں رجحانات کے درمیان ایسا تصادم تھا، گویا جنگ برپا ہے۳۔ بہ حیثیت مجموعی پوری زندگی کے دو رنگ الگ الگ ہو گئے: ایک وہ زندگی جس میں لہو و طرب تھا، لذات تھیں، نعمتیں تھیں، آسودگی تھی، دوسری طرف وہ زندگی جس میں مشقت تھی، تقا، زہد تھا، تکلیفیں اور مصیبتیں تھیں۔ عباسی ثقافت کی تصویر اسی دو رنگی اور تضاد سے بنی تھی ـــــ ایک طرف مسجدیں تھیں تو دوسری طرف میکدے، ادھر قاریانِ قرآن تھے تو اُدھر زمزمہ زنانِ طاؤس و رباب، کچھ لوگ نمازِ صبح کے منتظر رہتے تو کچھ باغوں میں صبوحی پینے کے لیے مضطرب، کوئی تہجد کے لیے جاگتا اور کوئی عشرت کے لیے۔ ایک طرف

۱؎ ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۱۴۱، ۱۴۲ ۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً۔ ج ۱ ص ۱۴۳

بسیار خوری بد ہضمی کا شکار تھے اور دوسری طرف غریبی کے مارے ہوئے فاقہ مست، ایک طرف ریب و شک اور دوسری طرف ایمان و یقین — عباسی دور میں ہر چیز تھی اور ہر چیز وافر تھی۔[1]

حکمراں طاقت کا حال یہ تھا کہ وہ تضاد کے خوفناک روگ میں مبتلا تھی۔ جب مطلق العنان اقتدار کی فطرت زور کرتی تو وہ انسانی جانوں اور ملت کے اموال پر بے محابا تصرف کرتے، اور جب ان کو مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کا خیال آتا اور ایمان، ضمیر اور سابق روایات تحریک کرتیں تو خدمت دین پر آمادہ ہو جاتے۔ وہ گردنیں اڑاتے بھی تھے اور جاں بخشیاں بھی کرتے تھے، وہ کوڑے بھی مارتے تھے اور عطیات بھی دیتے تھے۔ وہ مال چھینتے بھی تھے اور عطا بھی کرتے تھے۔ وہ عیش و عشرت میں بھی مدہوش رہتے تھے اور خدمت اسلام بھی کرتے تھے۔ وہ بگاڑ بھی پھیلاتے تھے اور پھر اصلاح بھی کرتے تھے۔ عباسی دور کا تضاد اکثر خلفا اور خصوصاً ہارون الرشید کی شخصیت میں متمثل تھا۔ وہ ایک طرف عبادت کرتا تھا تو دوسری طرف موسیقی سے لطف اندوز ہوتا، ایک طرف وعظ سن کر رونے لگتا، دوسری طرف نبیذ سے شادکام ہوتا۔[2] اسی طرح ایک طرف مامون کی دینی و علمی خدمات دیکھیے اور دوسری طرف فاسقانہ ثقافت اور اعتقادی فتنوں کی سرپرستی ملاحظہ کیجیے، جن کے متعلق شبلی جیسا آدمی بھی یہ کہتا ہے کہ اس نے ایسی بے اعتدالیاں کی ہیں کہ اس کی خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔[3] اسی طرح نہایت دلچسپ شخصیت ناصر باللہ کی تھی، شراب اور موسیقی کی ممانعت کر دی مگر خود لونڈیوں کے ایک گروہ کے اندر شراب کے نشے میں گم رہتا۔[4]

---

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۱۶۷

[2] ایضاً ص ۱۱۷ : ۱۱۸

[3] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۲۵ — [4] تاریخ الخلفاء ص ۳۰۰ و ۳۸۶

ان خلفاء کے مختلف ادوار کو دیکھیے تو پالیسی میں بار بار ردِّ عمل ہوتا دکھائی دیگا۔ کبھی زنادقہ کی سرپرستی ہے اور کبھی زنادقہ کے خلاف نہایت تند مہم، کبھی ثقافت کی سوزیز ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا انسداد شروع ہو جاتا ہے، کبھی دربار میں بدعنوانیاں زور پکڑتی ہیں اور کبھی نظم و نسق کی درستی کی فکر کی جاتی ہے۔ ایک کی پالیسی ایک رُخ پہ جاتی، دوسرے کی دوسرے رُخ پر۔ ایک کے کیے کرائے کو دوسرا ملیا میٹ کر دیتا۔

ان حالات میں اسلام پورے نظامِ زندگی کی کارفرما طاقت کیسے ہو سکتا تھا، وہ ایک محدود گوشے میں سمٹ گیا جو اپنی جگہ تھا بڑا اہم۔ یعنی قانون و عدالت کے دائرے میں، کیونکہ اسلامی قانون کو چھوڑ کر کسی اور طرف جانا ممکن نہ تھا۔

اس ثنویت کے متعلق بھرپور تنقید ہمیں بعد کے دور میں صرف ابن تیمیہؒ کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے دین و سیاست کی علٰحدگی کو باعثِ فساد قرار دیا۔ السیاسۃ الشرعیہ میں ہے:

> "جب کبھی دین و سیاست میں جدائی ہوتی ہے، دو گروہ معرضِ وجود میں آجاتے ہیں: ایک گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو دیندار تو ہوتے ہیں لیکن قوتِ حرب، جاہ اور مال سے ــــ جن کا دینِ خداوندی ضرورت مند ہے ــــ دین کی تکمیل نہیں کر سکتے، دوسرا گروہ ایسے والیانِ ریاست پر مشتمل ہوتا ہے جو مال اور حربی قوت کو بروئے کار تو لاتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد اقامتِ دین نہیں ہوتا۔ یہ دونوں گروہ مغضوب علیہم و الضالین ہیں[1]"

دولت و اسراف عباسی دور میں ایک طرف فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، دوسری طرف خراج کی آمدنی بیش بہا تھی، تیسری طرف صنعت، تجارت اور زراعت میں اضافہ ہوا۔ اس لئے دولت کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ خراج کی سالانہ آمدنی ہارون الرشید کے عہد میں

[1] السیاسۃ الشرعیہ

۷ ہزار ۵ سو قنطار (قنطار = ۴۰۰۰ ۸ دینار) تھی[۱]۔ سلطنت کی وسعت اور بین الاقوامی میل جول سے تجارت کو ترقی ہوئی، "طریق الحریر" پر چین تک سے تجارتی رابطہ قائم ہو گیا[۲]۔ بصرہ کے بعض متوسط تاجروں کی اوسط آمدنی ۱ لاکھ درہم سالانہ تھی اور بحری تاجر ۴ لاکھ دینار سالانہ تک کما لیتے تھے[۳]۔ لباس، فرش فروش، قالینوں، برتنوں، فرنیچر، شیشہ سازی، کاغذ سازی اور خوشبویات کی صنعتیں خوب بڑھیں[۴]۔ ترقی زراعت کے لیے دجلہ سے نہریں نکال کر ان کا جال پھیلا دیا گیا[۵]۔

دولت کا یہ سیلاب بالائی طبقہ کے ہاتھوں اسراف کی رودگاہوں میں بہنے لگا۔ تنخواہوں کا یہ حال تھا کہ وزیر اعظم ذوالریاستین (بہ عہد مامون) کو ۳ لاکھ درہم ماہوار ملتے تھے[۶]۔ ابن ابی صیبعہ کی تاریخ میں ہے کہ شاہی طبیب جبریل بن بخت یشوع (متوفی ۲۱۵ھ) کو خلیفہ کی طرف سے تنخواہ اور الأونس ملا کر ۱ لاکھ ۱۵ ہزار درہم ماہانہ ملتے تھے (روزہ، یوم الفطر اور خلیفہ کے یوم فصد کے الأونس الگ ہوتے)، بیگمات اور وزرا کی رقوم بھی ملائی جائیں تو میزان ساڑھے تین لاکھ درہم ماہانہ بنتی ہے[۷]۔ فضل بن سہیل وزیر اعظم ۴ لاکھ درہم ماہانہ پاتا تھا[۸]۔

پھر شاہی مصارف کا حال یہ تھا کہ مامون کے دسترخوان کا روزانہ خرچ ۱۰ ہزار درہم تھا[۹]۔ مامون نے حسن بن سہیل کی لڑکی سے نکاح کیا تو ۱۹ دن تک بارات سمدھیانے میں رہی جہاں داد و دہش کی بارش ہوتی رہی۔ اس نکاح کا حال ابن خلدون، ابوالفداء، ابن اثیر

[۱] معجم البلدان - ج ۱ ص ۲۲۶ [۲] عرب علوم اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ کے ہتی ص ۱۲۵۔
[۳] ایضاً ص ۱۲۷ [۴] ایضاً : ص ۱۲۷
[۵] ایضاً ص ۱۲۹ [۶] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۲،۱
[۷] ایضاً ص ۱۴۲ [۸] ایضاً ص ۲۲۱
[۹] ایضاً ۱۹۵

اور ابن خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ۵ کروڑ درہم کا صرفہ اٹھا محمد بن وہیب کے قصیدہ پر فی شعر ایک ہزار درہم انعام دیا گیا[1] پھر ذرا زبیدہ کی عیاشیوں اور اسراف و تبذیر کا حال پڑھیے[2] جہاں ایک خلیفہ (المتوکل) کے گھر چار ہزار کنیزیں جمع ہوں[3] جہاں ملکہ کے ایک لباس کا تھان ڈیڑھ لاکھ اشرفی میں تیار ہو اور جہاں بادشاہ (مامون) کے شبستان کے لیے ایک کنیز ایک لاکھ درہم میں خریدی جائے[4] وہاں اسراف کا حال کیا ہوگا؟

یہ بجا کہ رفاہ عامہ کے کام بھی ہوئے اور خوب ہوئے، تعمیرات ہوئیں، علوم کی ترقی پر خرچ کیا گیا مگر دیکھنے کی چیز ہے تناسب! پھر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ بیت المال (پبلک فنڈ) کے استعمال میں کیا اختیارات تھے اور کیا معمولات تھے! اس معاملے میں بادشاہوں (خصوصاً مامون، کو ہیرو قرار دینے والے شبلی[5] تک فرماتے ہیں کہ: "کل بیت المال (پبلک فنڈ) ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیا گیا[6] اس معاملے میں بچارے اسلام کو کون پوچھتا تھا۔ خلیفہ کی مذہبیت مالیات کے دائرے میں کم ہی قدم رکھ سکتی تھی۔

رندانہ ثقافت | اقتدار مطلق العنان ہو، اس پر الہامی ہدایت کی بالادستی باقی نہ رہی ہو بلکہ مذہب کو ایک الگ خانے میں محدود کر دیا گیا ہو، بیرونی افکار اور غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات موج در موج چلے آرہے ہوں اور دولت کے انبار قدموں میں ہوں تو پھر ثقافت اخلاقی حدود میں محدود رہ جائے یہ ناقابلِ تصور ہے ایسے حالات میں ثقافت کی طرح اہولپ پسندانہ، شہوانی اور رندانہ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی ثقافت تھی جو دمشق میں پروان چڑھی اور بغداد میں شباب کو پہنچی۔

عباسی ثقافت کے وہ کارنامے جو پبلک تعمیرات کے دائرے میں سامنے آئے۔

---

[1] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۴۲
[2] عرب اور اسلام (ترجمہ) از فلپ کے ہٹی ص ۱۰۳
[3] مسعودی ج ۲ ص ۳۰۰
[4] مسعودی۔ ذکر خلافت قاہر باللہ
[5] المامون۔ از شبلی ص ۲۰۲
[6] ایضاً ص ۲۰۰۔

وہ اپنی جگہ بڑے قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً بغداد، کرخ اور رصافہ وغیرہ شہروں کی تعمیر، نیز عمارات، سڑکوں، نہروں، شفاخانوں اور رصدگاہوں کی تیاری اور علمی مراکز کا قیام وغیرہ پھر خطاطی اور نقاشی کے فنون کو جو ترقی ملی وہ بھی پُر افادیت تھی۔ علاوہ ازیں عباسیوں نے معاشرہ میں اچھے رہن سہن کے لیے جو رجحان پیدا کیا اور ذوقِ جمال کو عام کر دیا، اس سے زندگی خوش آئند ہو گئی۔ مگر ان کاموں میں بھی اعتدال و توازن نہ تھا اور پھر اس کا اہتمام نہیں کیا گیا کہ دنیوی زندگی کی آرائشگی اخلاقی تقاضوں سے معاشرہ کو غافل نہ کر دے۔ چنانچہ یہ غفلت روز بروز بڑھتی گئی۔

لیکن ثقافت کا دوسرا دھارا مکمل طور پر نفس پرستی اور شہوت رانی کا دھارا تھا درحقیقت بیرونی عناصر عین سلطنت کے درمیان بیٹھ کر یہ طوفان اٹھا رہے تھے اور اس طوفان کا مرکز شاہی محل تھا۔ اولاً اہلِ فارس نے یہ مہم چلائی، انہوں نے "ماحول کو موسیقی، نبیذ اور لہو و طرب سے بھر دیا"[1] خصوصاً برامکہ نے دورِ عروج میں فارسی ثقافت کو خوب پھیلایا۔[2] ایرانی اثر کا حال یہ تھا کہ عید نوروز کو بھی قومی تہوار بنا لیا گیا۔[3] پھر اس ثقافتی مہم کی امامت عورتوں کے ہاتھ میں تھی۔ ملکہ خیزران کے سیاسی اثر کا حال کس کو معلوم نہیں۔ خود ملکہ زبیدہ نے سیاست کے ساتھ ثقافت میں عظیم حصہ لیا۔ اس کی عنبری شمعیں، اس کی جواہر سے مرصع جوتیاں، اس کے چاندی، آبنوس اور صندل کے بنواتے ہوئے خیمے جو دیبا و سمور سے آراستہ رہتے، ان کے چرچے تاریخ کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔[4] اکثر خلفاء پر عورتوں کا اثر گہرا تھا۔ المامون کے بارے میں ہارون الرشید کا قول تھا کہ "لونڈیاں اور عورتیں اس کی مشیر ہیں۔"[5] عباسیوں

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۱۹۱ [2] ایضاً ص ۲۰۲

[3] البیان والتبیین ج ۳ ص ۶۵ (اور اس سے آگے) [4] مروج الذہب المسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ

[5] تاریخ سیوطی، ص ۳۱۱۔

نے کنیزوں کے ریوڑ محلات میں بھر لیے تھے۔ مثلاً مذکور ہو چکا کہ خلیفہ متوکل کے ہاں ۴ ہزار کنیزیں تھیں۔ خلیفہ ہارون ایک بار دو ہزار مہوش دوشیزاؤں کے رقص سے لطف اندوز ہوا جس کا ہدایت کار وہ خود تھا[1]۔ اس سے بھی بڑے ایک نسوانی رقص سے المامون بہرہ اندوز ہوا[2]۔ نخاس باقاعدہ معاشرہ کا وسیع ادارہ تھا جہاں ہندی، سندھی، بکی، مدنی، سوڈانی، حبشی، ترکی، رومی اور ارمنی عورتیں اس طرح بکتیں جیسے مرغیاں، بٹیر اور پیاز اور شلجم بکتے ہیں[3]۔ لونڈیوں کو حرائر پر ترجیح دی جانے لگی، کیونکہ ایک تو بقول جاحظ ان کو پسند کر کے لیا جا سکتا تھا، دوسرے یہ فن تعشق، اظہار جمال اور موسیقی کی تعلیم سے آراستہ ہوتیں اور اس طرح حسن صورت کے ساتھ فنی حسن مل کر لطف کو دوبالا کر دیتا۔ علامہ شبلیؒ نے بھی لکھا ہے کہ کنیزوں کا مرتبہ اصلی ازواج سے بڑھ کر تھا[4]۔ چنانچہ خلفاء، امراء اور اغنیاء کے محلات مختلف قوموں اور نسلوں اور مذہبوں سے آنے والی اور مختلف طبائع رکھنے والی اور مختلف بولیاں بولنے والی عورتوں سے بھر گئے[5]۔ یہ لونڈیاں جو بقول جاحظ لازماً عصمت باختہ ہوتی تھیں، اپنے اندر سفلگی اور بازاری پن کا جو رنگ رکھتی تھیں وہ محلات پر اور پورے معاشرے پر پڑ رہا تھا۔ عورت انسانیت کے کندھوں پر سوار تھی۔ امین جیسے رند کو موقع ملا تو اس نے ثقافتی ترقی کے لیے نوجوان لڑکیوں کی باقاعدہ تنظیم قائم کر ڈالی جو زلفیں کٹاتی تھیں، لڑکوں کا سا لباس پہنتیں اور ریشمی عمامے باندھتی تھیں[6]۔ جب کسی ثقافت میں شہوت پرستانہ رجحانات عورت کو بزم عشرت کی شمع بنا لیتے ہیں تو پھر وہ اندھیرا پھیلتا ہے کہ جسے سورج بھی نہیں مٹا سکتا۔

[1] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ، کے، حتی۔ ص ۱۰۸ [2] ایضاً ص ۱۲۴

[3] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۸۹

[4] المامون، ص ۲۰۴

[5] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر محمد امین مصری ج ۱ ص ۹۸

[6] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ، کے، حتی۔ ص ۱۲۴

آئیے ذرا اس ثقافت کا ایک منظر دیکھیے کہ معاشرے کا سربراہ کار المامون کس طرح بزمِ ثقافت کو فروغ دیتا ہے:

"بزمِ عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھتا ہے، بے تکلف اور رنگین احباب جمع ہیں، پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دورِ شراب چل رہا ہے۔ ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں۔ یارانِ باصفا بدمست ہونے جا رہے ہیں۔[1]"

جب قیادت یوں جام چھلکانے لگے تو معاشرہ خم لنڈھانے پر اتر آتا ہے۔ محل کا رنگ سارے بغداد پر اور بغداد کا رنگ پوری مملکت پر چھا جاتا ہے۔ موسیقی خوب پھیلی اور ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی۔ یہاں تک کہ پبلک مقامات پر، راستوں میں خلفاء کے محلوں میں، امیروں اور غریبوں کے گھروں میں مغنی اور مغنیات نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ خلفاء (مثلاً واثق اور مستنصر) اور ان کی اولاد میں نغموں کے سُر ایجاد کرتے ہیں[2]۔ علیّہ (بنتِ خلیفہ مہدی) ۳۰ راگ گا سکتی تھی[3]۔ غرض فنونِ لطیفہ، غناء، مصوری اور رقص کی ایک تحریک چل پڑی[4]۔ خلیفہ معتصم نے محل کی دیواروں پر شکار کے مناظر کے علاوہ عریاں عورتوں کی تصویریں ایک نصرانی مصوّر سے بنوائیں[5]۔ کتوں اور مرغوں کو سدھانے کے لیے استاد اور بازی گر وغیرہ جمع کیے گئے[6]۔ نرد اور شطرنج کے کھیلوں میں شدید انہماک پیدا ہوا، کبوتر پالے جاتے اور ان کی بھاری قیمتیں مقرر کی جاتیں، قمار بازی اتنی پھیلی کہ غرباء کے جھونپڑوں تک جا پہنچی، نقاشی اور مصوری کو ترقی ہوئی، حتیٰ کہ والدہ واثق کی خواہش پر امام احمد بن حنبل کو بلوانے کے لیے جو شاہی سواری بھیجی گئی اس کی جھولی پر چیتے کی تصویر

[1] المامون ۔ از علامہ شبلی نعمانی۔ ص ۲۰۱ — [2] کتاب الاغانی ج ۸ ص ۱۶۲

[3] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۹۷ — [4] ایضاً۔ ص ۹۵

[5] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ ۔ کے حتّی ص ۱۴۸ — [6] ایضاً ص ۱۰۷

تھی (امام نے اسے استعمال نہیں کیا)[۱]۔ مجسمہ سازی بھی شروع ہوگئی۔ دارالشجرہ میں ۱۵ مصنوعی سوار ایستادہ تھے[۲]۔ مقتدر کی ماں نے ننھے پوتے کے لیے ایک پورے گاؤں کا ماڈل چاندی سے بنوایا جس میں مکانات، آدمی اور تمام سامان چاندی کے تھے[۳]۔ ملک میں عشرت کدے کھل گئے جن میں شراب کے دور چلتے اور طوائفیں گانا سناتیں۔ پروفیسر حتی نے لکھا ہے کہ زیادہ تر ان اڈوں کو یہودی اور عیسائی چلاتے تھے (عرب اور اسلام ص ۱۲۰) ان کے قیام کے لیے امین نے خاصا کام کیا[۴]۔ ایسا ایک عشرت کدہ کوفہ میں "ابن امین" کا تھا جس کی مشہور ترین مغنیہ "سلامۃ الزرقاء" تھی[۵]۔ اس ثقافت کی تصویر ادب نے الف لیلہ کے آئینہ میں محفوظ کردی ہے جسے الجہشیاری (وفات ۹۴۲ء) نے لکھا تھا اور جس میں بعد کے لوگوں نے اضافے کیے ہیں۔

اس ثقافت کا اثر شعر وادب پر بہت ہی برا پڑا۔ مثلاً ابراہیم ابن سیّابہ جو آزاد منش، بے باک اور غلاموں سے دل بستگی رکھتا تھا، اسلام پر زندیقانہ حملے کرتا۔ عام شعراء نے لوگوں کو فسق و فجور اور اباحت کی طرف دعوت دینے میں حد کردی۔ یہ لوگ دین پر سخت تعریض کرتے اور حرمت شراب کے اسلامی قانون اور آخرت کے اعتقاد کا بری طرح مذاق اڑاتے[۶]۔ ابونواس کا ایک شعر یہ ہے:۔

فَاِنْ قَالُوا حرامٌ، قُل حرامٌ — ولکن اللذۃ فی الحرامِ

(ہاں تو اگر لوگ کہتے ہیں کہ شراب حرام ہے تو تو بھی مان لے کہ حرام ہے۔ مگر لطف و کیف تو حرام ہی میں ہوتا ہے)

ایک اور شعر یہ ہے:

---

۱ الف لیلہ از رئیس احمد جعفری۔ ص ۵۰۹ — ۲ معجم البلدان۔ ذکر دارالشجرہ

۳ البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۷۰۔ — ۴ طبری ج ۵ ص ۹۵۴

۵ الاغانی ج ۱۳ ص ۱۲۷ — ۶ ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۱۵۳-۱۵۴

۷ ایضاً ص ۱۹۲ — ۸ ایضاً ص ۱۹۳

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْرًا وَقُلْ لِیْ ھِیَ الْخَمْرُ ۔ وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا اِذَا اَمْکَنَ الْجَھْرُ

(دیکھو، مجھے شراب پلاؤ، اور یہ کہہ کر پلاؤ کہ یہ شراب ہے۔ جب کھلم کھلا پینا ممکن ہے تو پھر پلاتے ہوئے یہ پردہ راز نہ رکھو)

یہ تو پھر بھی ذرا گوارا اشعار ہیں، بصرہ میں بشار بن برد نے فحش شاعری کا طوفان اٹھا رکھا تھا اور مغنّیات اس سے گانے کے لیے شعر حاصل کرتی تھیں[1]۔ عرب جاہلیت کی شاعری میں رندیت تھی مگر ایک حد تک، اب تو یہ ہوا کہ شہوانیت تمام اسالیب و مظاہر میں رچی ہوئی تھی اور بدترین لفظ بدترین مفہوم کے ساتھ لیا جاتا[2]۔

اس رندانہ یا شہوانی مکتبِ شعر و ادب کے بالمقابل ایک ردّعمل کے طور پر صوفیانہ مدرسۂ فکر بھی کام کرنے لگا جس کا ایک مشہور فرد ابوالعتاھیۃ تھا۔ اس کی شاعری زندگی سے بیزاری اور کنارہ کشی کا پیغام دیتی ہے، کیونکہ حالات کی رَو میں بہنے کے لیے جو لوگ تیار نہیں ہوتے وہ جب اصلاح کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے تو تصوّف کی پناہ لیتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت فسق و فجور کی طرف جانے والے بھی اور تصوف کی طرف رُخ کرنے والے بھی ــــ دونوں ہی زندگی کے تلخ حقائق سے فرار چاہتے ہیں ــــ ایک میخانے میں پناہ لیتا ہے، دوسرا خانقاہ میں۔ ابوالعتاہیہ کے یہ مشہور قول سنیے:

رغیف خبز یابس ۔ تاکلہ فی زاویہ
وکوز ماءٍ باردٍ ۔ تشربہ من صافیہ
وغرفۃ ضیقۃٌ ۔ نفسک فیھا خالیہ
او مسجد بمعزلٍ ۔ عن الوریٰ فی ناحیہ
معتبرا من مضیٰ ۔ من القرون الخالیہ
خیر من الساعات فی ۔ فیئ القصور العالیہ

---

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۱۹۲۔ [2] ایضاً ص ۱۹۳

یعنی اگر ایسا ہو کہ تو ایک گوشۂ خلوت میں سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھائے، صاف چشمے سے پانی کا ایک کوزہ بھر کر پیاس بجھالے، ایک تنگ سے جھونپڑے میں تن تنہا بیٹھے، یا لوگوں سے الگ ہو کر کسی دور افتادہ مسجد میں اللہ اللہ کرے۔ جو لوگ اگلے زمانوں میں گزرے ہیں ان سے عبرت پکڑے، تو یہ عالیشان محلوں میں وقت گذارنے سے بہتر ہے۔

نفس پرستانہ اور رندانہ ثقافت کے نتیجہ کے طور پر سخت اخلاقی بحران نمودار ہوا اور جنسی اخلاق بُری طرح تباہ ہوئے[1]۔ حکمراں طبقہ جب یوں اخلاقی تباہی کا علمبردار بن جائے تو اصلاح پسندوں کی بے بسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو تصوف کی طرف گئے اور کچھ وہ تھے جو اضطراب اور بے بسی کی وجہ سے دہشت انگیزی (TERSORISM) کے ذریعے اصلاح کرنے پر اتر آئے۔ بغداد میں انارکی پھیل گئی جس کا ذکر گبن نے بھی کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی جماعت کے بعض نوجوان ایک بار بے قابو ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور عیش پرست امراء کے گھروں میں گھس کر شراب کے برتنوں اور موسیقی کے آلات کو توڑنے کی مہم شروع کر دی۔ ان میں سے بعض نے مغنیوں اور طوائفوں کو پیٹا بھی[2]۔ مطلق العنان اقتدار کے تحت ایسا ہونا بعید نہیں ہوتا۔ غالباً اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ اہلِ بغداد نے شراب نوشی اور مغنیہ عورتوں کی کثرت سے پریشان ہو کر وفد کی شکل میں خلیفہ سے احتجاج اور مطالبہ کیا کہ شراب اور بدکاری کے اڈے بند کر دیئے جائیں۔ اس وفد نے ایک اور واقعہ پر فریاد بھی کی۔ ایک شہری نے کسی سپاہی کی داشتہ کے عود کے تار توڑ ڈالے، سپاہی نے شہری کو پیٹ ڈالا۔ اہلِ بغداد کا مطالبہ تھا کہ اس سپاہی کو سزا دی جائے مگر خلیفہ بیچارا خود بے بس تھا[3]۔

---

[1] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ کے، حتّی ص ۱۷۷ و ۱۲۰

[2] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر علی ابراہیم حسن۔ ص ۸۴ (تمام بڑی تاریخوں میں یہ ذکر موجود ہے)

[3] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۳۸۔

ایسی تھی بغداد کی ثقافتی جنت جس کے متعلق کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ لیس بغداد منزل العبّاد (بغداد خدا پرستوں کی جگہ نہیں ہے)۔ بشر بن حارث کا مقولہ تھا کہ کسی مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بغداد میں رہے بسے[1]

بات لمبی ہو گئی، مگر اس مسرفانہ اور رندانہ ثقافت کا جو وبال غریب طبقوں پر پڑ رہا تھا اس کا ذکر کیے بغیر یہ ثقافتی جائزہ مکمل نہ ہو سکے گا۔ وہ بغداد جس کی تعمیر میں ۴ سال تک ۱۰ لاکھ معمار[2] اور مزدور مصروف رہے تھے اور جس پر ۲ کروڑ درہم خرچ ہوئے تھے[3] اور جس میں ۳ ہزار مسجدیں، ۱۰ ہزار حمام اور ۸۶۰ مطب تھے اور جہاں بالائی طبقہ۔ جس کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ملک کے بڑے شہروں میں ۲۰ تا ۲۵ ہزار تھی[4]۔ داد عیش دے رہا تھا، وہاں عظیم طبقاتی تفاوت کی وجہ سے عوام میں افلاس و بدحالی کا دور دورہ تھا[5]۔ ابوالعتاہیہ نے غریب طبقوں کو سامنے رکھ کر بڑا دردناک شہر آشوب کہا ہے۔ دوسرے شعراء نے بھی ان حالات کا ماتم کیا ہے۔ صرف ایک قطعہ یہاں دیا جاتا ہے:

تصلح للموسر لا لامریٔ ... یبیت فی فقر و افلاس
لو حلّها قارون ربّ الغنیٰ ... اُصبح ذا ھمّ و وسواس
حورٌ و ولدانٌ و من کلّ ما ... نطلبُہٗ فیھا، سوی الناس

یعنی خوش حال آدمی کے لیے تو یہ جگہ اچھی ہے مگر اس شخص کے لیے سازگار نہیں جو فقر و فاقہ میں گذران کرتا ہے۔ اس میں اگر اتفاقاً قارون جیسا صاحب دولت آ اترے تو وہ مصیبت اور پریشانی کا شکار ہو جاتے۔ یہاں نہیں حور و غلمان اور جو جو کچھ چاہو مل سکتا ہے، مگر بس ایک انسان نہ ملیں گے۔

---

[1] تاریخ بغداد۔ ج ۱ ص ۵ [2] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) ۔۔ ص ۱۰۳

[3] نجوم زاہرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ ص ۲۷۷

[4] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) ص ۹۲ [5] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری ص ۱۳۱

ابوالعتاہیہ کا ایک شعر اور جو اس نے ہارون کے سامنے ایک نظم میں پڑھا تھا اور اسے رلا دیا تھا ؎

کیف اصلاحُ قلوبٍ انما ھُنَّ قروح

(دلوں کی اصلاح کیا ہوگی جبکہ وہ ہمہ تن ناسور بن چکے ہیں)

آج سوچیے! کیا یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بنا کردہ ثقافت تھی؟ یہ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کی سیراب کردہ ثقافت تھی؟ — کیا یہ اسلامی ثقافت تھی؟ اور کیا اس ثقافت کے لباس میں انسانیت کا وہ پیکر زندہ رہ بھی سکتا تھا جو قرآن کا مطلوب ہے؟ — ہرگز نہیں! — یہ غیروں کی ثقافت تھی، یہ باہر سے آئی، پاسبانِ ملت معاشرہ کا بچاؤ اس سے نہ کر سکے اور "سمرقند و بخارا" اس کے خالِ ہندو پر لٹا دیا۔ یہ ایک رقاصہ کی طرح آئی اس نے اپنے غمزوں کے ساغر بھر بھر کے لنڈھائے اور پورا معاشرہ بدمست ہو کر اس کے گرد ناچنے لگا اور ۵ سو برس لمبی شبِ عشرت بیت گئی — مگر لوگوں کی آنکھیں اس وقت سے پہلے نہ کھل سکیں جب قانونِ قدرت نے فتنۂ تاتار کا کوڑا (۶۹۳ھ) ان کی پیٹھوں پر برسایا، کہ اس کے ناقابلِ بیان ہونے کو ایک شاعر یوں بیان کرتا ہے:

وکان ما کان مِمّا لستُ اذکرہٗ فظُنَّ خیراً ولا تسألْ عن الخبرِ[1]

(جو ہونا تھا سو ہوا، میں اسے بیان نہیں کرتا تم بس اچھا ہی گمان کرو اور حالات دریافت نہ کرو۔)

مختلف عناصر کا اختلاط اسلامی معاشرہ ابھی ابتدائی تربیت پا ہی رہا تھا کہ اس میں باہر سے نئے اور کچے عناصر کا داخلہ تیزی سے شروع ہو گیا۔ اختلاطِ عناصر کے اس خطرے کو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے محسوس کیا، مگر بعد کے ادوار میں رفتار اور تیز ہو گئی۔ عرب اور موالی، اہلِ فارس اور ترک، اہلِ کتاب اور مجوس اسلامی معاشرہ کے ساتھ خلط ملط ہوتے

[1] الفخری ص ۲۹۷

چلے گئے۔ تعلیم و تربیت کا وہ مستحکم نظام جو خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا اور جس کے تحت ہر علاقائی حکمران کی ابتدائی ذمہ داریوں میں یہ بات شامل تھی کہ رعایا کو قرآن وسنت کی تعلیم دیں اور ان میں اقامت عبادات کا انتظام کریں، توسیع معاشرہ کے ساتھ ساتھ اسے اور زیادہ پھیلانے اور مضبوط و مؤثر بنانے کی ضرورت تھی، مگر یہ روز بروز کمزور ہوتا گیا اس سے تین تباہ کن نتائج پیدا ہوئے:

پہلا یہ کہ عصبیتوں کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بلا خود عربوں میں قبیلہ پرستی کی شکل میں موجود تھی جس کا زور مشکل ابھی ایک حد تک توڑا جا سکا تھا۔ لیکن ایک بار جب یہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی حریفانہ کشاکش سے قیادت کی صفوں میں از سر نو اٹھ کھڑی ہوئی تو پھر نیچے تک پھیلتی چلی گئی۔ مثلاً کوفہ میں یمانیوں اور نزاریوں کے درمیان قبیلوی عصبیت برابر نزاع شدید کا باعث بنی رہی[1]۔ پھر ہر علاقے کے عربوں اور ان کے موالیوں میں باہمی تعاون کی وجہ سے جو رابطہ پیدا ہو جاتا، اس کے تحت وہ دوسرے علاقے کے متحدہ عربوں اور موالیوں سے برسر کشمکش رہتے۔ اس طرح قبیلوی عصبیت نے علاقائی عصبیت کی راہ اختیار کر لی[2]۔ بعد کی ساری تاریخ میں اس بلا نے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ بے شمار فتنوں اور لڑائیوں کا باعث بھی بلا بنتی رہی۔ پھر عصبیتوں کا ایک طوفانِ عظیم وہ تھا جو عربوں اور دوسری قوموں کے درمیان پیدا ہوا۔ بنو امیہ کے دور میں عربوں کے تفوق نے فارسیوں میں سخت قسم کی جوابی عصبیت پیدا کر دی۔ عباسی دور آیا تو فارسیوں کے عروج میں عربوں کے جذبات کھولتے رہے۔ فارسیوں کا زور توڑنے کے لیے جب ترکوں کو لایا گیا تو فارسیوں اور ترکوں کی باہمی رقابت کا چکر چلا اور اس کی وجہ سے بارہا سازشیں اور خونریزیاں ہوئیں۔

---

[1] فجر الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ص ۱۸۰۔

[2] ایضاً ص ۱۸۱

دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ملت کا وہ عالمِ فکر و اخلاق جو نو تعمیر شدہ تھا، درہم برہم ہو گیا۔ اہلِ فارس اسلامی معاشرہ میں آئے تو اپنے ساتھ زردشت اور مانی، مزدک اور بزرجمہر کی تعلیمات اور تاریخی حکایات کو بطور سرمایۂ افتخار لے کے آئے، اس کے ساتھ ایرانی ادب اور موسیقی لائے۔ اسی طرح ترک آئے تو رومی اثرات کا ریلا ان کے ساتھ آیا، پھر یونانی حکمت کے دفتر اسلامی معاشرہ تک پہنچے، اسی طرح ہندوستان سے ویدانت کا فلسفہ اور دوسرے علوم کے ابواب منتقل ہوئے، پھر یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں نے اپنے اپنے عقاید و حکایات کے دفتر کھول دیئے۔ اس فکری اختلاط نے ذہنوں کے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ مناظروں اور بحثوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور طرح طرح کے فتنے انگڑائیاں لینے لگے۔ مثلاً شیعہ سنی فسادات کثرت سے ہونے لگے[۱]۔ مراۃ الجنان میں ایک بڑے شیعہ سنی فساد کا تذکرہ ملتا ہے جو حرّان (جس شہر سے امام ابن تیمیہ کو نسبت ہے) میں واقع ہوا (۴۷۶ھ) اسی تصادمِ افکار نے فتنہ خلقِ قرآن کو ابھارا[۲]۔ بڑے شہروں میں اعتقادی اور کلامی بحثوں کے دنگل قائم ہو گئے۔ ایسا ہی ایک دنگل بصرہ میں ہوا کرتا تھا جس سے حضرت امام ابو حنیفہ نے بھی دورِ اوائل میں دلچسپی لی۔ مناقب موفق میں ہے کہ وہاں جا جا کر خارجی فرقوں سے بحثیں کرتے مگر تجربے کے بعد ان کا دل بصرہ کے بحث پسندوں سے کھٹا ہو گیا۔ فرماتے ہیں:

"میں دیکھتا ہوں کہ ان کے قلب بے حس ہیں، ان لوگوں کو کتاب و سنت کے خلاف بات کہنے میں ذرا باک نہیں[۳]"

تیسرا اثر یہ ہوا کہ اسلام کی پابند اخلاق ثقافت کی جس تباہی کا آغاز بنو امیہ کے دور میں ہوا تھا اس کی تکمیل عباسی دور میں اسی اختلاطِ عناصر کی وجہ سے ہوئی۔ دین کی بالادستی کا ختم ہو کر اس کا ایک محدود مذہب کی حیثیت اختیار کر جانا خود ہی کچھ کم حادثہ نہ تھا، اس کے

---

[۱] ابن تیمیہ۔ از مولانا محمد یوسف کوکن پوری ص ۴۷۔ [۲] المامون۔ از شبلی نعمانی ص ۲۱۰ تا ۲۱۲

[۳] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ص ۱۳

ساتھ ساتھ شاہی خاندان میں عزتِ نسب، علوِ حسب جن روایات کے ساتھ قائم تھا وہ بھی اختلاطِ عام کی وجہ سے کمزور پڑ گئیں۔ دیس دیس اور بھانت بھانت کی لونڈیوں کا محلوں میں بھر جانا، پھر شاہی خاندانوں کی اولادوں کی ناقابلِ انضباط کثرت ۔۔۔ مامون کے دور میں یہ تعداد ۳۳ ہزار تھی)، چنانچہ علامہ شبلی جب مامون کو عقائد کے لحاظ سے "معجون مرکب" قرار دیتے ہیں تو اس کا سبب مختلف زبانوں کی تعلیم و معاشرہ کو قرار دیتے ہیں[1]۔ ان حالات میں اسلامی معاشرہ اپنی مخصوص ثقافت پر کیا جما رہ سکتا۔ انتشار ناگزیر تھا۔ ثقافتی انتشار کے عالم میں جہاں مئے و مغاں اور شراب و رباب کا دور دورہ ہوا وہاں یہ بھی ہوا کہ مامون نے ایک بار متعہ کی حلت کا فرمان جاری کر دیا جسے قاضی یحییٰ بن اکثم نے جائز پر کھیل کر رکوایا[2]۔ اسی طرح معتضد باللہ کے دور میں (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ) متعہ، نبیذ، موسیقی اور دوسرے تمام ممنوعات کو حلال کرنے کے لیے ایک کتاب مرتب کر کے خلیفہ کے ہاتھ میں دی گئی۔ حکومت پرست تاویل بازوں کے اس کارنامہ کے خلاف وقت کے قاضی نے دربار میں پورے استدلال سے بات کی یہاں تک کہ کتاب جلوا دی گئی[3]۔

اس اختلاطِ عناصر کے مفاسد کا ازالہ جبھی ہو سکتا تھا کہ اقتدار خود اسلامی فکر و ثقافت پر ثابت قدم ہوتا اور عوام الناس کو اس پر قائم رکھنے کے لیے نہایت مضبوط اور وسیع تعلیمی نظام جاری کرتا۔ لیکن شاہی دربار کا سفینہ تو خود بغیر کسی بادبان اور لنگر کے فتنوں کے سیلاب میں بہا جا رہا تھا وہ معاشرہ کو کیا بچاتا۔

فوج کی سیاسی مداخلت کسی بھی حکومت میں دیکھنے کی بڑی اہم چیز یہ ہوتی ہے کہ مرکزِ قوت کہاں واقع ہے جس کی پشتیبانی سے حکمران کی مسند قائم رہتی ہے۔ صحت مند معاشروں میں یہ مرکز جمہور کے درمیان ہوتا ہے اور رائے عام سلطنت کو تھامتی ہے۔ لیکن مستبد اور

---

[1] المامون ۔ از علامہ شبلی نعمانی ص ۲۰۸ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۹۹، ۲۰۰

[3] تاریخ الخلفا ص ۳۷۹

مطلق العنان اقتدار کا حقیقی سہارا فوج ہوتی ہے کیونکہ اسے نظریہ اور دلیل کے بجائے تلوار کے زور سے فرماں روائی کرنی ہوتی ہے۔ جہاں مرکزِ قوت فوج کے اندر ہو وہاں فوج سیاست زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عباسی حکومت کی بیماریوں میں سے بہت بڑا روگ یہ تھا کہ اس کی رگِ جاں فوج کے پنجہ میں تھی۔

عباسی حکومت کا قیام و بقا چونکہ ایرانی سپاہیوں پر منحصر تھا اور آئے دن کی جنگوں اور بغاوتوں میں ان کی خدمات درکار ہوتی تھیں اس لیے وہ سلطنت پر حاوی رہے ادھر وزارت کی کرسی پر بیٹھ کر ایرانیوں نے سیاسی اثر کا سکہ خوب چلایا۔ خصوصاً برامکہ کے دورِ زرّیں میں ایرانی اثر و نفوذ درجہ کمال پر تھا۔ ایک ایرانی النسل وزیر کے ہاتھوں آلِ ساسان کی طرز کا نظامِ حکومت رائج ہو گیا۔[1] پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیفہ کے بعد ولیعہد کی بیعت کرنے یا ولیعہد کی عدم موجودگی یا اس کے بالغ ہونے کی صورت میں خلیفہ کو نامزد کرنے کے لیے جب بھی عمائدینِ سلطنت کی مجلس بیٹھتی ہے تو لازماً فوج کے افسر اس کا ایک اہم عنصر ہوتے ہیں۔

ایرانی تسلّط نے حد سے بڑھ کر جب خلیفہ کو بے بس کرنا شروع کیا تو توازن کے لیے ترکوں کو لایا گیا۔ سب سے پہلے خلیفہ معتصم نے اپنی ترکی والدہ کے اثر سے ترکوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ ہزاروں ترکی غلام خریدے اور ان کے لیے دیبا کی وردیاں اور جواہرات سے مرصع سنہری ٹپکے بنوائے۔[2] اسی طرح واثق باللہ نے ایک ترکی سردار کو نائب السلطنت مقرر کیا اور اسے اپنے ہاتھوں سے تاج پہنایا۔[3] بجائے اس کے کہ عباسی خلفاء کسی مرحلے پر جمہور کی طاقت کی طرف متوجہ ہوتے اور رائے عام کو اپنے گرد منظم کرتے انہوں نے ایک زہر کا علاج ویسے ہی دوسرے زہر سے کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلفاء کی طاقت ترکوں کے ہاتھ میں

---

[1] HAROON ALRASHID - BY PALMER. P37-38

[2] تاریخ الخلفاء ص ۲۴۲ [3] ایضاً ۹ - ۳۴۸

چلی گئی۔ فوج کا نشۂ قوت اتنا بڑھا کہ سپاہی کھلے بندوں قانون کو پامال کرتے، لوگوں کو گھوڑوں تلے روندتے، مال لوٹ لے جاتے، عورتوں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے مگر حکومت آڑے نہ آسکتی[۱] خلیفہ معتزّ کی تخت نشینی پر نجومیوں سے پوچھا گیا کہ خلیفہ اور اس کی سلطنت کی عمر کیا ہوگی؟ ایک مسخرہ بول اٹھا کہ "یہ ترکوں سے پوچھیے"[۲] چنانچہ یہ خلیفہ ترکوں اور دوسرے عناصر کی مشترکہ بغاوت کا نشانہ بن کر دردناک موت مرا[۳]۔ مستعین باللہ (۲۴۸ھ تا ۲۵۱ھ) کو ترکوں نے معزول کر کے نظربند کر دیا اور بعد میں قتل کر ڈالا۔ اسی طرح مہدی بن واثق (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ) کو معزولی، قید اور ظلم کے مراحل سے گذار کر قتل کیا گیا۔ معتضد باللہ کے زمانے میں خلیفہ کا تقرر اور عزل فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی بغاوت میں مارا گیا[۴] (۳۲۰ھ) قاہر باللہ (۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ) کو بھی فوج کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور سپہ سالار مونس نے وزیر اعظم سے مل کر اسے معزول کر دیا[۵]۔ پھر آگے چل کر عباسیوں نے آل بویہ کی اور ان کے بعد سلجوقیوں کی مدد سے اس بلا سے نجات پانا چاہی مگر جس سے مدد لی وہی گردن پر سوار ہوگیا اور پہلوں سے بدتر ثابت ہوا۔ اسی فوجی اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نئے عہدے قائم کیے جاتے رہے، مثلاً (بہ عہد راضی باللہ) ایک نیا عہدہ امیرالامراء قائم کیا گیا لیکن خود امیرالامراء خلیفہ پر چھا جانے لگے[۶] پھر فوج کی سیاست زدگی اور بادشاہ گری کی وجہ سے نظام نظم ونسق کی رگوں میں سازشوں کا زہر سرایت کر گیا اور بار بار بغاوتیں اور تصادم ہوتے (۵۰۰ سال میں ایسے واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سر چکرا جاتا ہے) اور ہر بااثر شخصیت اور عنصر دوسروں کے خلاف مصروف تگ و تاز رہتا۔

فوج کے انہی حالات کو دیکھ کر ابن المقفع نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کے

---

[۱] تاریخ طبری ج ۷ ص ۰۰۰ ۔۔۔ [۲] الفخری ص ۲۲۱ ۔۔۔ [۳] ابن الاثیر ج ۷ ص ۶۷، ۶۹

[۴] تاریخ الخلفاء ص ۲۵۵ ۔۔۔ [۵] الفخری ص ۲۴۹

[۶] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۰۔

لیے دستور یا کوئی ضابطہ ہونا چاہیے اور وہ تدبیریں بتائیں تھیں جن سے فوج کی سیاسی بالادستی کو روکا جاسکتا تھا[1]

نظم و نسق کی تباہی | عباسیوں نے تمدنِ عالم میں یہ اضافہ تو ضرور کیا کہ مطلق العنان فرماں روائی کے لیے ہیئتِ سیاسیہ کو بڑی نشوونما دی، نئے نئے عہدے ایجاد کیے، مختلف شعبے ہائے حکومت بنائے، کئی قسم کے دفاتر قائم کیے اور ان کے سیاسی تجربات نے بہت سا نیا سرمایہ تاریخ کے دامن میں ڈالا۔

مگر اوپر جو حالات ہم نے بیان کیے ہیں — یعنی مطلق العنان اقتدار، جمہور کے بجائے محدود طبقے کی بالادستی، فوج کی سیاسی مداخلت، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، قومی مالیات کا صرفِ بے جا، اور رندانہ ثقافت کا زور شور، نت نئی بغاوتوں اور سازشوں کے ریلے — ان چیزوں نے نظم و نسق کو گھن لگا دیا۔

اس سلسلے میں ہم ایک بار پھر ابن المقفع کے رسالۃ الصحابہ (جس میں خلیفہ کے درباریوں پر تبصرہ کیا گیا ہے) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس نے وقت کے شاہد کی حیثیت سے حالات کی تصویر بعد والوں کے لیے مرتب کردی ہے۔ وہ عمائدِ سلطنت کو بدترین حرکات کا مرتکب قرار دیتا ہے جو حسب نسب اور سیاست کے لیے غارت گر ہیں۔ یہ اشرار کو مقرب بناتے ہیں اور اخیار کو دُور ہٹاتے ہیں۔ اس کے رسالہ کی عبارتیں بتاتی ہیں کہ رشوت اور سفارش کا دَور دورہ تھا اور اعیان اور افسران اور ملازمین اپنے حدودِ اختیار سے تجاوز کرکے دوسرے شعبوں میں مداخلت کرتے تھے[2] پھر ابن المقفع نے نسخۂ شفائیہ تجویز کیا ہے کہ:

"عام لوگ اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہوتے کہ خواص سیدھے راستے پر نہ پڑیں اور خواص کی درستی نہیں ہوتی جب تک کہ ان کا سربراہ راست روی

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۲۱۵ [2] ایضاً ص ۲۲۲

اختیار نہ کرے — پس جب خواص دین و عقل سے آراستہ ہوں تو پھر عوام کی اصلاح ہو سکتی ہے[1]

کسی حکومت کا سب سے محترم شعبہ قضا کا شعبہ ہوتا ہے اور پھر اسلام میں تو قاضی خدا و رسول کے قانونِ عدل کا امانت دار بن کر بیٹھتا ہے۔ لیکن امویوں کی ڈالی ہوئی طرح کے مطابق قضا کا شعبہ بھی حکومت کی مداخلت بے جا سے مجروح ہوتا رہا۔ واقعہ ہے تو اموی دور کا، لیکن دیکھئے کہ قضا کا مقدس عہدہ حکومت خود رشوت یا انعام کے طور پر دیتی ہے۔ مروان نے ایک بار قاضی عابس بن سعید سے بات کی تو معلوم ہوا کہ کتاب، سنت اور فرائض کے علم سے کورے ہیں۔ پوچھنے پر ان کے تقرر کا حال معلوم ہوا۔ قصہ یہ تھا کہ یزید کی بیعت سے جب عبداللہ بن عمرو بن العاص نے انکار کیا۔ تو امیر معاویہ نے سلمہ والیٔ مصر کو لکھا کہ عبداللہ کو درست کرنے کے لئے کون آمادہ ہے۔ عابس بن سعید نے اپنی خدمات پیش کیں اور پولیس کی گارد ساتھ لے کر ان کے گھر کا محاصرہ کر کے آگ لگانے کی تیاری کی۔ چاروناچار عبداللہ بن عمرو نے بیعت کے الفاظ ادا کر کے مخلصی حاصل کی اس پر عابس کو قضا کا منصب ارزانی ہوا[2]۔

قاضی عبداللہ کے سامنے ایک تاجر اور فوجی جنرل کا مقدمہ آیا۔ خلیفہ مہدی نے بصیغۂ راز حکم بھیجا کہ فیصلہ جنرل کے حق میں کیا جاتا ہے۔ قاضی نے فیصلہ حق کے مطابق جنرل کے خلاف کر دیا۔ اس پر قاضی صاحب معزول کر دیئے گئے[3] قاضی حفص بن غیاث نے ملکہ زبیدہ کے چہیتے مرزبان کے خلاف ڈگری دے دی تو ملکہ ہارون کے سر ہو گئی کہ اس قاضی کو معزول کر دیا جائے۔ آخر ہارون...... نے قاضی حفص کا تبادلہ کوفہ میں کر کے جان چھڑائی۔

---

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۲۲۴ [2] ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۶ بہ حوالہ حسن المحاضرہ۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰۹

تھا تو کیا، وزیر اعظم تک اس خرابی احوال (Corruption) کا شکار ہو جاتا ہے۔ علی بن عیسیٰ نے حالات کی اصلاح کی مہم شروع کی تو مالیات کا انضباط بھی کیا۔ والدہ خلیفہ مقتدر کی ایک مصاحبہ نے عید الاضحیٰ پر رقم طلب کی تو وزیر اعظم نے معذرت کر دی۔ اس مصاحبہ کی ناراضی کی وجہ سے وزیر اعظم کو برطرف کر دیا گیا[1]۔

اپنے سیاسی مصالح کے لیے خود خلیفہ رشوت دیتا ہے۔ فتنہ خلقِ قرآن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے جو شاہی فرامین اسحٰق بن ابراہیم نائب بغداد کو بھیجے گئے تھے ان میں سے ایک میں خلقِ قرآن کا قائل بنانے کے لیے مختلف افراد کے لیے مختلف ترکیبیں لکھی گئی ہیں۔ اسی سلسلے میں فضل بن غنم کے متعلق خلیفہ خود لکھواتا ہے کہ اس نے مصر میں اپنے لیے جو کچھ بنایا ہے اور قلیل مدت میں جو اموال سمیٹے ہیں ان کے متعلق بازپرس نہ کی جائے گی۔ خط کا ایک فقرہ یہ ہے کہ چونکہ اس شخص کو درہم و دینار کا لالچ بے حد ہے۔ فلیس بمستنکر ان یبیع ایمانہ طمعا فیھما۔ یعنی خلیفہ جانتا ہے کہ معاملہ ایک شخص کا ایمان خریدنے کا ہے[2]۔

نیچے کیسے رشوت نہ پھیلتی۔ قاضی عافیہ کو ایک مقدمہ میں رشوت دینے کی کوشش کی گئی۔ وہ کاغذات لے کر دربار پہنچے اور درخواست کی کہ مجھے فارغ کر دیا جائے کیونکہ میری متاعِ ایمان خطرے میں ہے۔ اسی طرح مدینہ میں کچھ باغی بنی ہلال اور بنی سلیم کے آدمی محبوس کیے گئے۔ انہوں نے فرار کے لیے پہرہ داروں کو ۵ ہزار دینار کی رشوت دی مگر اتفاق سے فرار کا منصوبہ ناکام رہا[3]۔

غالباً رشوت کی آمدنی کی وجہ سے عدالتی مناصب کی قیمت چڑھی اور بڑی بڑی رشوتیں ان کے حصول کے لیے دی جانے لگیں۔ ابو العباس عبد اللہ بن شوارب نے معز الدولہ سے

[1] ابن اثیر ج ۸ ص ۲۶ — [2] طبری ج ۷ ص ۲۰۳

[3] طبری ج ۷ ص ۳۲۵

قضا کا منصب ۲ لاکھ درہم سالانہ کے بدلہ میں حاصل کیا اور اس کا باضابطہ قبالہ لکھ کر اسے دے دیا[1]۔ اسی طرح بروایت ابن الطقطقی ابن مقلہ نے ۵ لاکھ دینار رشوت میں راضی باللہ سے وزارت کا عہدہ حاصل کیا[2]۔ ابن جبیر نے قائم بامر اللہ سے ۳۰ ہزار دینار پر وزارت خریدی[3]۔

گورنری کا منصب بھی رشوت کے عوض بکنے لگا۔ چنانچہ یحییٰ بن خاقان نے (دورِ مقتدر میں) کوفہ کے لیے ایک ہی دن ۱۹ آدمیوں کو گورنری کے تقرر کے پروانے دے دیئے اور سب سے رشوت وصول کی۔ اتفاقاً راستے میں یہ سارے گورنر جمع ہو گئے تو ان کو معلوم ہوا[4]۔ ایک شاعر نے اس رشوت خوار وزیر کی ہجو میں شعر کہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ ایسا وزیر ہے جو رقعہ لکھنے سے اکتاتا نہیں۔ ایک شخص کو والی بناتا ہے پھر ایک ساعت بعد اسے معزول کر کے دوسرے کو مقرر کر دیتا ہے۔ جس سے رشوت پہلے وصول ہو جاتے ان کو مقرب بنا لیا ہے" وغیرہ۔

نظم و نسق میں عدم استحکام کا حال ایک موقع پر یہاں تک پہنچا کہ مقتدر کے دور میں یکے بعد دیگرے ۱۲ وزیر مقرر ہوئے۔

قدرتی امر تھا کہ ایسے حال میں جرائم کا زور ہو جاتے۔ چنانچہ شہری مجرموں کو تو چھوڑیئے خود فوجی ملازمین نے بغداد میں لوٹ مار مچا دی (۲۰۱ھ، ۲۰۲ھ) لوگوں کو مارتے پیٹتے جبراً رقمیں وصول کرتے، دکانوں سے مال اٹھائے جاتے۔ آخر تنگ آ کر شہری خود اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حفاظت خود اختیاری کے اصول کے تحت مجرمین کے مقابلے کی ٹھانی۔ دو تنظیمیں بن گئیں۔ ایک خالد بن درویش کے تحت جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام آئینی حدود میں کرنے کے لیے اٹھی، دوسری سہل بن سلامہ انصاری کے تحت جس کا مقصد تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی تھا مگر طریق کار زیادہ جابرانہ تھا۔ یعنی جو بھی بدراہ ہو اسے

---

۱ تاریخ الخلفاء ص ۲۶۵، ۲۶۶ ۲ الفخری ص ۲۰۷ ۳ ایضاً ص ۲۱۴

۴ الفخری ص ۲۴۰، ۲۴۱ ۵ طبری ج ۷ ص ۱۸۸

قوت سے ٹھیک کیا جائے خواہ وہ سلطان ہو یا کوئی اور۔[1]

مجرمین کی دیدہ دلیری کا حال یہ تھا کہ ایک بار چوروں نے دارالعامہ میں گھس کر بیت المال میں نقب لگائی اور بڑی آسانی سے ۲۴ ہزار درہم اور کچھ دینار لے بھاگے۔ معاملہ چونکہ سرکاری تھا اس لیے بعد میں پکڑے گئے۔[2]

عباسی دور ہی میں ابوالہیثم جیسی تاریخی شخصیت بھی تھی جس نے حضرت امام احمد بن حنبل کو تلقینِ استقامت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو میں چوری کرتا ہوں، مجھے بار بار پکڑا گیا اور میری پیٹھ پر ۱۸ ہزار تازیانے پڑے ہیں مگر میں آج تک باز نہیں آیا، آپ تو اللہ کی راہ میں اٹھے ہیں۔[3]

علم و حکمت کا فروغ ملتِ اسلامیہ کی اساس اعتقاد اور علمِ حقیقت پر رکھی گئی تھی اور تعقل و استدلال اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ قرآن ذوقِ علم کو مہمیز کرتا ہے اور حدیث اسے جلا دیتی ہے۔ ایسی ملت فتوحاتِ علمی کی مہم میں کبھی کوتاہی نہیں دکھا سکتی۔ چنانچہ دورِ نبوت ہی میں مسلمانوں کے اندر غیر زبانوں کے جاننے والے سیکرٹری اور ترجمان پیدا ہو گئے، تورات کے مطالعہ کی طرف بھی توجہ ہو چکی تھی، پھر خلافتِ راشدہ میں سیاسی ضرورت سے مختلف علاقوں کے مذہبی و سماجی احوال کی رپورٹیں حاصل کی جانے لگیں۔ اور اس کے بعد بنو امیہ کے دور میں فارس اور روم کے علم و ادب کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ یہی رو عباسی دور میں تیز تر ہو گئی۔ مامون کا دور علمی ترقی کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہے۔

عباسی خلافت کے دورِ زریں میں تین قسم کے علوم پر توجہ دی گئی: ایک فلسفہ و ادب کے تراجم، دوسرے فنی، ٹکنیکل اور تجرباتی علوم، جیسے طب، مساحت، ہیئت، ریاضی، سائنس وغیرہ۔ تیسرے غیر مذاہب کی معلومات۔

ان علوم کی طرف توجہ کا ایک سبب یہ تھا کہ اقوامِ غیر کے نو مسلم اور غیر مسلم عناصر

---

[1] طبری ج ۱۰ ص ۴۸-۲۴۱   [2] طبری۔ حالات ۲۳۱ھ   [3] ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری ص ۶۱۶

مسلمانوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے جو ان کے لیے نئی تھیں اور وہ لوگ ان کو فخر کے ساتھ پیش کرتے کہ ہمارے پاس ایسے علوم ہیں جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے اسلوب پر بحثیں چھیڑتے تو مسلمان ان کے ساتھ نہ دے سکتے۔ سو غیر اقوام کے علوم کو حاصل کرنے کا شوق امڈ پڑا۔ مامون نے دار الحکمت قائم کیا تو اس کا بڑا شعبہ دار الترجمہ تھا۔ اس ادارے کے تحت متواتر ۱۰۰ برس تک ترجمہ کا کام ہوتا رہا[1]۔ مترجمین کو بڑے بڑے معاوضے دیئے جاتے اور پھر ہر ترجمہ شدہ کتاب کے عوض سونا یا چاندی تول کر دیا جاتا[2]۔ حکیم لیو یونانی کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مامون نے شاہ یونان کو ۵ من سونا دینا منظور کیا[3]۔

علم بڑی نعمت ہے خواہ جہاں سے ملے۔ حضورؐ نے حکمت کو مسلمان کی اپنی ہی گم گشتہ دولت قرار دیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کی تلقین بھی کی ہے مگر ترقی علم کی عباسی تحریک کی ایک اساسی کمزوری سخت ضرر رساں ثابت ہوئی۔ یعنی بیرونی علوم کو مرعوبانہ ذہن کے ساتھ لیا گیا۔ جہاں اغیار کا سیاسی نفوذ کارفرما تھا، جہاں ان کی ثقافت خواہشات کی مسجود بن رہی تھی وہاں ان کے علوم کے لیے مرعوبیت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ اپنی بنیادوں سے متزلزل ہوتے ہوئے کسی معاشرہ پر اگر باہر سے فکری حملہ ہو جاتے تو پھر اس کا تمام عالم افکار زیر و زبر ہو جاتا ہے۔ یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ معاشرہ کی قیادت تنقیدی زاویۂ نگاہ سے محروم تھی۔ بیرونی علوم کے لیے قرآن کو حکم اور دین کو کسوٹی بنانے کے بجائے الٹا عقلی ہم دین کو بیرونی طرز فکر کے سانچے میں ڈھالنے کی شروع ہو گئی۔ اقبال کے الفاظ کے مطابق وہاں اپنی خودی میں آشیانہ برقرار نہیں رہا تھا۔

---

[1] اسلام اور عرب (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ۔ کے۔ حتی ص ۱۱۲

[2] المامون از علامہ شبلی ص ۱۶۵ [3] ایضاً ص ۱۷۰

معاشرہ میں مرعوبانہ ذہنیت پیدا کر کے اور اسے اپنے سرچشمۂ فکر سے کسی قدر غافل رکھ کر آزادی خیال کی فضا پیدا کر دیجیے، پھر کوئی اساسی اعتقاد بھی صحیح سالم نہ رہ جائیگا۔ عباسی حکومت جو سیاسی پہلو سے تو کسی کو آزادی خیال کی ہوا بھی لگنے دینے کی روادار نہ تھی، اس نے اعتقادات اور اخلاقیات کے معاملے میں آزاد خیالی کا کھلا میدان نوجوانوں کو فراہم کر دیا۔ خود دربار کی طرف سے ایک مجلس مناظرہ لگتی جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ جمع ہوتے، ہر سہ شنبہ کو یوم مناظرہ ہوتا اور خود مامون اس میں حصہ لیتا[1] مناظروں کا یہ ذوق بغداد اور دوسرے تمام شہروں میں عام ہو گیا اور گھر گھر بحثیں ہونے لگیں۔ ایرانی اور یونانی فلسفوں کے نشتر سے کے اسلام کے ایک ایک عقیدہ کی جراحی کر ڈالی گئی۔ یہ اس قوم کا حال تھا جو دنیا کو اسلامی نظام کا درس دینے کے لیے مامور ہوئی تھی۔ اس فکری ابتری کے ساتھ اخلاقی تباہی کا ورود لازم تھا اور وہ ہوا۔ اسی آزادی خیال کی فضا میں فتنۂ خلق قرآن ابھرا اور آزادئ خیال کا عنان بردار خلیفہ خود ہی اتنا تنگ خیال ثابت ہوا کہ اس کے اختیار کردہ عقیدۂ فاسد سے اختلاف کرنے والوں کی جان پر بن گئی۔ ایک صاحب نظر کا تبصرہ اس علمی ترقی کے متعلق ملاحظہ ہو:-

"اس میں شبہ نہیں کہ یہ علوم و فنون کی ترقی اور شعر و ادب کی گرم بازاری مسلمانوں میں بڑی حد تک دماغی بلند پروازی اور ذہنی ثقافت و عروج کے پیدا ہو جانے کا باعث ہوئی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اسلامی عقائد کی سادگی اور راسخ العقیدگی کو صدمۂ عظیم پہنچا اور یونانی علوم و فنون کی گرم بازاری نے خالص اسلامی افکار کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلمان عقیدہ و خیال کی وحدت سے کٹ کر ایک نہایت خطرناک قسم کی دماغی لامرکزیت میں مبتلا ہو گئے"[2]

---

[1] المامون از علامہ شبلی ص ۱۸۰ [2] مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سعید احمد ایم اے ص ۹۰

قابلِ قدر اشخاص اور کارنامے ہم نے عباسی دور کا جو نہایت اجمالی سا جائزہ لیا ہے اس کے پیچھے کوئی تعصب اور بے انصافی کام نہیں کر رہی اور ہم اچھے اشخاص کے اچھے کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے سامنے عباسیوں کی بعض گراں بہا فتوحات ہی نہیں ہیں، ان کے ایسے روشن اقدامات بھی ہیں جن میں اسلامی روح جھلکتی ہے۔ پھر جن خلفاء، سلاطین یا وزراء نے حالات کو روبا صلاح کرنے کے لیے مساعی کی ہیں ان کو بھی خراجِ تحسین پہنچنا چاہیے مثلاً خلیفہ منصور نے قصرِ شاہی اور سرکاری امور میں اسراف کو ختم کرنے کی موثر کوششیں کیں نیز خافلہ لہو و لعب کا گذر اس کے ہاں کبھی نہ ہوا[1] مہدی جس نے تختِ نشینی کے پہلے ہی دن باپ کی وصیت کے مطابق تمام قیدی رہا کر دیئے تھے اور ضبط شدہ جائدادیں واگذار کر دی تھیں، اپنے غرور، سخت گیری اور عیش پسندی کے باوجود مظلوموں کی دادرسی کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا[2] ہارون کا یہ کام کتنا بڑا ہے کہ اس نے امام ابویوسف کے ہاتھوں قانونِ شریعت کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کر دیا معتصم کا معاملہ دیکھیے کہ ایک مسلمہ رومیوں کی قید میں "وامعتصماہ" پکارتی ہے اور معتصم کو جونہی اطلاع ملتی ہے وہ "میں پہنچا" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ فوجوں کی تیاری شروع ہو جاتی ہے اور وہ حملہ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ابوشجاع وزیر کو دیکھیے کہ اس کے دور میں خلیفہ نے شیعہ سنی فساد کے سلسلے میں دس ممتاز اصحاب کے گھروں کو ڈھا دینے کا حکم دیا تو اس نے ان گھروں کی قیمت گرہ سے ادا کی[3] پھر مہدی باللہ بن واثق (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ) کو دیکھیے جس کے ذہن پر یہ احساس طاری رہا کہ بنو عباس میں ایک شخص بھی عمر بن عبدالعزیز جیسا نہ نکلا۔ اس نے اسراف و تنعم کا خاتمہ کر دیا۔ ایوان کے مرفعوں کا صفایا کر دیا، پالتو درندوں، بھینڈسوں اور مرغوں کو ذبح کرا دیا، دسترخوان کا خرچ ۱۰۰ درہم روزانہ تک کم کر دیا، روکھی سوکھی روٹی کھاتا اور اس کے باوجود بغاوت کا نشانہ بن کر جاں بحق ہوا[4]

---

[1] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ ۳ ج ا ص ۶۵، ۶۶ [2] الفخری ص ۱۶۱

[3] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر علی ابراہیم حسن ص ۱۶۵، ۱۶۶ [4] مسعودی ج ۸ ص ۱۹

پھر ناصر باللہ نے اپنی شانِ رندی کے باوجود فضا کو درست کرنے کے لیے خاصی کوشش کی۔ رقص و غنا کے پیشے بند کرائے اور شراب کی ممانعت کی۔[1] طائع باللہ اور قادر باللہ نے نہایت اچھے اچھے کام کیے۔ مقتدی بامر اللہ نے زنا، جوئے اور شراب کا انسداد کیا۔[2] پھر کتنوں کی علمی خدمات ہیں، کتنوں نے بعض ضرورت مندوں، مقروضوں اور اہلِ علم کو عطایا دیے۔ ایک بار ہارون نے ایک درویش منش عالم کے ہاتھ خود دھلوائے۔ کیا کیا واقعات گنوائے جائیں!

اور پھر اس سے کیا انکار کہ عباسی خلفا آگے چل کر اگرچہ سیاسی لحاظ سے بے اختیار ہو کر ابن ابی اشرف کے اس شعر کے مصداق ہو گئے تھے کہ:

القاب مملکۃ فی غیر موضعھا کالھر یحکی انتفاخاً صورۃ الاسد

(ان لوگوں پر سلطنت کے القاب کا استعمال بے محل ہے۔ ان کی مثال ایسی بلی کی سی جو پھول کر شیر کی نقل اتارتی ہے)

مگر دوسری طرف یہ لوگ ظاہری مذہب داری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس لیے اسلام کے سرپرستوں کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے۔ یوں کہیے کہ کم سے کم وہ علامتی حیثیت سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ تھے۔ اسی وجہ سے سیاسی اثر کھو دینے پر بھی ان کا روحانی اثر باقی رہتا ہے۔[3]

مگر ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اجتماعی زندگی کی گاڑی کدھر جا رہی تھی۔ بہ حیثیت سوانح نگار تو کسی شخص کو ان میں سے ہر آدمی کی خوبیوں اور جزئی واقعات کو بھی سامنے لانا چاہیے بلکہ تاریخ کے طالب علم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ نظام کیا تھا۔ اور پھر بہ حیثیت مسلم اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ قافلہ احوالِ اسلام کی قیادت میں چلا یا انحراف کر گیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ہر اقدام کو ترقی کہہ کر اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ترقی اسلام کے مطابق ہے؟ یا اسلام سے آزاد ہو کر؟ یا اسلام کو پامال کر کے؟ (باقی)

[1] تاریخ الخلفا ص ۳۰۰، ۳۰۶ [2] ایضاً ص ۲۹۳ [3] ضحی الاسلام ج ۱ ص ۲۷